شعری ادب کے ترجمے میں شعریت کے مسائل

ڈاکٹر فاخرہ نورین☆

Translation of poetry has been considered impossible on account of problems faced by the translator of poetry.Poetry is not an arrangement of words or compilation of thoughts.It is expression of strongly felt emotions in the best order of words,which creat an impact on the reader and touches heart directly.Transfer of that impact is jist of translating poetry.Impact is not created by words or feeling or arrangement of properly selected words,it is a sythetical result.A translator who is succesful in tranferring that impact into an other language and recreate it ,can be called a successful translator.Otherwise he is more of a traitor than of a translator.

شاعری کے ترجمے کی کوناکوں مشکلات کو دیکھ کر ہی انیسویں صدی میں سیموئل جانسن نے اعلان کر دیا تھا کہ شاعری ترجمہ کی ہی نہیں جا سکتی جبکہ دوسری طرف وکٹر ہیوگو نے انیسویں صدی میں یہ کہ کر اس پر مہر لگا دی کہ شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں کرنا ایک مجرد اور ناممکن کام ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ترجمہ کسی مصنف یا شاعر کے خیال کے ساتھ ساتھ اسلوب اور انداز کی منتقلی ہے تو پھر ظاہری بات ہے کہ شعر کا ترجمہ شعر ہی ہو سکتا ہے۔

> ادبی تراجم میں ..... ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے جن کے ذریعے خیالات ادا کیے گئے ہیں۔ گو قوتِ استدلال کا اظہار یہاں بھی درکار ہوتا ہے لیکن اس کی اپیل مختلف ہوتی ہے یہ صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان کے تمام قوائے احساس کو اپیل کرتی ہے جن میں احساس جمال، احساسِ صورت اور صوت و نغمہ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے شاعری میں جو ادب کی ایک مخصوص صنف ہے الفاظ

☆ شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، راولپنڈی

> کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے۔اس میں اظہار خیال ہمیشہ احساس کے ذریعے ہوتا ہے۔اس لیے اگر ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔شعر کا ترجمہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔وہ بھی اس وقت جبکہ وہ اصل خیال کو اپنے احساسات سے گزارے اور یہ طریقہ کار تقریباً نیم تخلیقی ہو جاتا ہے کیونکہ احساسات داخلی ہوتے ہیں۔اور تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ دوسرے کے جسد میں منتقل نہیں ہو سکتے۔دوسروں کے احساسات پر اتنا قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا جتنا ان کے خیالات پر۔[1]

خیالات و احساسات پر قابو پانے کی یہ حالت ترجمے کے ممکن کو ناممکن بنا دیتی ہے مگر کیا یہ مشکلات اس درجہ طاقت ور ہیں کہ شاعری کبھی ترجمہ ہی نہیں ہو پائی؟ جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے۔انگریزی سے اردو ترجمہ بلکہ کامیاب ترجمے کے ضمن میں نظم طباطبائی کی ''شام غریباں'' ولیم گرے کے مرثیے (Elegy in a Churchyard) کا ترجمہ اور ایمرسن کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ جو علامہ اقبال نے ''رخصت اے بزمِ جہاں'' کے عنوان سے کیا، کی مثال دی جا سکتی ہے۔

شعر کے ترجمے میں شعریت یا وہ تاثر جو ترجمہ نہیں ہو پاتا اس سلسلے کی سب سے بڑی مشکل ہے۔کیونکہ یہ واضح رہے کہ ہر کلامِ منظوم شعر نہیں ہوتا۔الفاظ کی ایسی ترتیب و توازن جس میں موسیقیت ہو، یا ایک خاص ردھم ہو، نظم یا منظوم تو ہو سکتا ہے مگر اسے شاعری نہیں کہا جا سکتا۔شاعری کے ترجمے میں ممکن ہے مترجم مناسب قوافی اور ردیف یا بحر کا انتخاب نہ کر پائے۔ مگر وہ اس تاثر کی باز آفرینی کر پائے جو نظم یا شعر کو اصل زبان میں پڑھ کر اس کے دل پر قائم ہوا تھا۔کروچے تو اس تاثر کی باز آفرینی کا اتنا قائل ہے کہ وہ اس تاثر کے بغیر ترجمے کو محض تبصرہ قرار دیتا ہے۔اور اس بے تاثر تبصرے سے بچنے کے لیے ترجمے کو ایک نئی جہت عطا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ......بے ذوق ترجمے محض تبصرے ہوتے ہیں، لیکن ترجمے کی ایک امکانی جہت بازیافت نہیں بلکہ اسی تاثر کی باز آفرینی کے طور پر ہے۔ اچھا کہلانے کے قابل ترجمہ اصل فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔[2]

اس کے ذیل میں اردو غزل کے ترجمے کی مثال دی جا سکتی ہے جس کی علامات و تشبیہات و استعارات کو ظاہر ہے کہ دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ہے یا شاید ناممکن ہے۔

کیونکہ کسی ایک زبان کے کسی لفظ کا مساوی یا ہم پلہ لفظ دوسری زبان میں کم ہی ہوتا ہے۔غزل تو اپنی تہہ داری اور متنوع المعانی و جہات ہونے کی بدولت جانِ اردو ہے اس کی روح اور ان لسانی نزاکتوں کو کیسے منتقل کیا جا سکتا ہے۔خاص طور پر اگر کوئی ایہام کو شعرا کو ترجمہ کرنا چاہے تو جہاں لفظ کی ذو معنویت ہی شاعر کا فن اور شعر کا حسن ہے اسے مساوی یا ہم پلہ لفظ سے کیسے تبدیل کیا جائے گا اور اس تاثر کو کیسے منتقل کیا جائے گا جو

اس کے عارض کو
دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری
زندگانی ہے

جیسے اشعار پڑھ کر پیدا ہوتا ہے۔خیالات کو منتقل کرنا یا ان کا ترجمہ کرنا مشکل نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی خیال کتنا ہی مشکل اور گنجلک کیوں نہ ہو اس کو کسی نہ کسی طرح احاطہ تحریر میں یا اظہار کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے مگر مسئلہ الفاظ اور ان کی وابستگیوں کو بیان میں لانے کا ہے۔ دار و رسن اور صیاد کا مضمون اور اس کی تمام تر وابستگیاں میر کے لیے کچھ اور، جرأت کے لیے کچھ اور، غالب کے ہاں چیزے دگر اور فیض کے ہاں بالکل ہی الگ ہو جاتی ہیں لہٰذا ان وابستگیوں کو سمجھنا اور ترجمے میں منتقل کرنا محض زبان کی واقفیت اور خیال کی ترسیل سے کہیں آگے کا کام ہے۔

اردو غزل کے ترجمے میں غزل کے اسلوب اور چاشنی کی منتقلی ایک مشکل عمل ہے اور شاعری کے ترجمے میں پیش آمدہ مشکلات کی بہترین مثال بھی ہے۔ یوسف ظفر کی غزلوں اور منتخب منظومات کا انگریزی ترجمہ سجاد شیخ نے کیا ہے۔غزل اور غزل کی لغت کو نہ سمجھنے کی ایک مثال ان تراجم سے دی جا سکتی ہے۔

''مرنے کے بعد قبر سے
کرتے نہیں کلام
جینے پہ روز لڑتے نہیں آسماں سے ہم

Alive, we fight not daily with
Heavens
Dead, we speak not with the grave[۳]

آسمان سے لڑائی، محاورتاً نصیب سے شکوے اور نصیب لکھنے والے سے شکایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس کو لفظی ترجمہ کر دینے سے معانی کی محض ایک پرت انگریزی میں منتقل ہوتی ہے اور چونکہ آسمان سے لڑنا اردو شاعری کی روایت میں جانا پہچانا تصور ہے مگر

انگریزی ادب کے قاری کے لیے آسمان سے لڑائی کا وہ مفہوم اس تک نہیں ابلاغ ہو سکے گا لہٰذا غزل کو ترجمہ کرنے کے لیے محض لفظی ترجمہ اور ایک زبان کے لفظ کا دوسری زبان میں مترادف اور ہم پلہ لفظ دے دینے سے مترجم کا فریضہ ادا نہیں ہو جاتا اور نہ ہی ایسا ترجمہ، ترجمہ کہلائے گا۔

بعض صورتوں میں لفظی ترجمہ بھی معانی کا ابلاغ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر بعض الفاظ جو کسی زبان کے تہذیبی رچاؤ میں بس جانے کی بدولت تلمیحات کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں ان کو ترجمہ کرنے کے بجائے دوسری زبان میں اگر بعینہٖ منتقل کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔اس کی مثال یوسف ظفر ہی کی شاعری سے درج ذیل ہے:

''شہر ہیں اہلِ خرد اہلِ ہوس کے
زنداں
ایک مجنوں انھیں ملتا تو یہ صحرا ہوتے

Cities are prisions of Lusty Reason
Mongers
Had they found one Majnu, they'd
became limitless deserts!"[4]

ایک اور مثال:

''ہے ترا نام زندگی
ہم کو
قیس و فرہاد اپنا نام
کریں

Your name signifies life for us
Let Qais and Farhaad popularise
their names"[5]

ان اشعار کے ترجمے میں لفظی ترجمہ ہی کیا گیا ہے جس سے معانی کا ابلاغ ممکن ہو گیا ہے۔ مجنوں اور قیس و فرہاد کے نام تلمیحات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو ترجمے میں بھی اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ حواشی میں ان تلمیحات کی ہلکی سی وضاحت کر دی جاتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے قالب میں جو اشعار پر لطف اور تاثر سے بھرپور محسوس ہوتے ہیں انگریزی میں ترجمہ ہوتے ہی سپاٹ اور بے تاثر قسم کی سطور لگتے ہیں۔

زبانوں کے مزاج کا فرق ترجمے کے اس عمل کو مشکل بناتا ہے اور اس کو ذہن میں رکھے بغیر اگر کسی فن پارے کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ناکام ہو جائے گی۔ کیونکہ پروفیسر ظہور الدین کے بقول:

> ترجمہ نگار کو صرف فن پارے کا مفہوم ہی دوسری زبان میں منتقل نہیں کرنا ہوتا اس کے ساتھ جو مزاجی، تہذیبی اور فکری وجذباتی انسلاکات جزولاینفک کی طرح موجود ہوتے ہیں۔ان کو بھی منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزرے بغیر کوئی ترجمہ مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس کے بغیر کوئی ترجمہ تجربے کی منزل تک نہیں پہنچ پاتا اور جب تک وہ اس منزل سے ہمکنار نہیں ہوتا ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ جولوگ ترجمے کا مطلب محض مفہوم کی ترسیل گردانتے ہیں وہ اصل فن پارے کی حرمت مجروح کرتے ہیں۔[۲]

انھی انسلاکات کو سمجھ کر انھیں ترجمے میں منتقل کرنا مترجم کا کام ہے اور یہی انسلاکات شاعری کے ترجمے کو مشکل بنا دیتے ہیں کیونکہ شاعری جذباتی کیفیت کے ساتھ ساتھ قومی و مزاجی کیفیت کا اظہار بھی ہے۔لہٰذا دو زبانوں کی واقفیت سے بڑھ کر شاعری کا ترجمہ زبانوں کے مزاج کی تفہیم کا متقاضی بھی ہے۔

انگریزی سے اردو میں شاعری کے ترجمے میں جو چیزیں رہ جاتی ہیں ان میں سے ایک تو اس عہد کا شعور سے غفلت یا بے توجہی برتنے کا نتیجہ ہے۔شاعری داخلی جذبات کے اظہار پر مبنی صنف سخن سہی مگر ان عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو کسی بھی شاعر کی شخصیت کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔ان میں معاشرتی، سیاسی، معاشی اور ملکی و علاقائی صورتِ حالات کے ساتھ ساتھ موروثی، ذاتی حالات و واقعات اور خصوصیات کے علاوہ کسی واقعے سے متعلق شاعر کی ذاتی رائے یا تاثر تک اہمیت رکھتا ہے۔انگریزی شاعر تو لکھتے ہی زندگی ہیں۔وہ زندگی جو وہ جیتے ہیں جو ان کے اردگرد بکھری ہوئی ہے۔مثلاً ولیم ورڈزورتھ کو لیک ڈسٹرکٹ سے نکال کر کسی اور مقام (Setting) میں رکھیں تو اس کے تصورِ فطرت کو سمجھنا یا بیان کرنا ناممکن ہو جائے گا۔تھامس ہارڈی کا تصورِ فطرت ورڈزورتھ سے بالکل متصادم ہے اور اس کی وجہ (Essex) اور اس کے گردونواح میں بکھری وہ فطرت ہے جو سکون نہیں دیتی نہ نظر کو طراوت بخشتی ہے بلکہ انسانی سعی کے تمام تر مظاہر سے متصادم ہے اور اس کی تمام تدابیر کو ناکام کرنے میں مصروفِ پیکار رہے۔

مترجم اگر ان تمام مرکب عناصر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اگر شاعر کے اپنے رجحان

یا میلانِ طبیعت سے بھی واقف ہو تب بھی شعر کا ترجمہ شاید اس طرح نہ کر سکے مگر سوال وہی رہ جاتا ہے کہ کیا ترجمہ نہ کیا جائے؟ کیا مشکلات سے ہار مان لی جائے اور ان ادبی و تخلیقی سُوتوں کو زبان کی حد بندیوں کا شکار رہنے دیا جائے؟ جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے۔ یوں ترجمہ دوسرے درجے کا تخلیقی کام نہیں بلکہ یک ایسا فن بن جاتا ہے جو نہایت محنت، لگن اور مشقت کا متقاضی ہے۔ مترجم پر ایک دوسری زبان کے شاعر کو یوں زندہ کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی ہے کہ وہ شاعر اپنے مافیہ و ماعلیہ کے ساتھ یا کم از کم ان کی قریب ترین شکل میں نئی زبان (T.L) میں متعارف ہو جائے۔

انگریزی کے شاعر جان ملٹن کی طویل رزمیہ نظم ''پیراڈائز لاسٹ'' کے بارہ دفاتر کے متن کو اردو کا جامہ شوکت واسطی نے پہنایا ہے۔ اس ترجمے کو دیکھ کر واقعی گمان ہوتا ہے کہ اگر ملٹن اردو زبان میں لکھتا تو شاید وہ انھی الفاظ و تراکیب اور اسلوب کو منتخب کرتا۔ مگر اس ترجمے کے درج کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ان چند باتوں کا ذکر کر لیا جائے جو اس رزمیہ کو شاہکار بناتی ہیں۔

فنی طور پر کامل اور زبان پر ماہرانہ عبور، اپنے عظیم الشان موضوع کے شایانِ شان زبان و تراکیب اور خیالات، جامعیت اور اختصار، تلمیحات و استعارات کا استعمال اور فقروں کی چستی ایسی خوبیاں ہیں جو ملٹن کی اس نظم کو شہرتِ عام اور بقائے دوام بخشتی ہیں۔ ملٹن نے وہ اسلوب اختیار کیا جو صرف اسی سے مخصوص ہے اور یوں وہ صاحبِ طرز شاعر کے طور پر سامنے آتا ہے جس کے اسلوب کو کوئی اس کی طرح نہیں برت پایا۔ فن پارہ جتنا بڑا ہو اس کے مترجم کے لیے مشکل بھی اسی طرح کی درپیش ہوتی ہے اور یہاں تو یہ نظم ہے جو طویل نہیں طویل تر ہے اور ایک ایک سطر میں تلمیحات اور ضرب الامثال بن جانے والے جملے، جن کو منظوم ترجمہ کرنا اور یوں کرنا کہ معانی تبدیل نہ ہونے پائیں، ایک بہت بڑا معرکہ سر کرنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی چوک ہوئی تو نظم کا سیاق و سباق تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مذہبی پس منظر اور اساطیر پر مبنی یہ عالمگیر داستانِ آدم و حوا جتنی مقبولِ عام ہے اتنی ہی باریکیوں اور پیچیدگیوں کے حامل اسلوب میں ملٹن نے اسے قلم بند کیا ہے۔ ان تمام عوامل کے ساتھ ساتھ یہ ادبی اور فنی شاہکار بھی ہے۔ چنانچہ شوکت واسطی کے ترجمے کو ان تمام خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے جو ملٹن اور اس کی رزمیہ نظم کو اردو میں زندہ کر سکے۔

ابلیس کی پہلی تقریر جو اس نے حواس درست ہونے اور خود کو شکستہ و پامال دیکھنے کے بعد بالذبیب سے مخاطب ہو کر کی، اس کے حوصلے اور عزمِ صمیم کی عکاس ہے، کا انگریزی اور اردو متن درج ذیل ہے:

.....What thogh the feild be lost?
All is not lost - the unconquerable will,
And study of revenge, immortal hate,
And courage never to submit or yeild;
And what is else not to be overcome.
That glory never shall his wrath or might
Extort from me. To bow and sow for grace
With suppliant knee and deify his power.
Who, from the effort of his arm, so late
Doubted his empire - that were low indeed;
That were ignominy and shame beneath
This downfall; since, by fate, the strength of gods,
And this Empyreal substance, cannot fail;
Since through experience of this great event,
In arms not worse, in foresight much advanced,
We may with more successful hope resolve
To wage by force or guile eternal war,
Irreconcilable to our grand Foe,
Who now triumphs, and in the success of joy
Sole reigning holds the tyranny of Heaven.[۷]

''کیا ہوا ہاتھ سے اگر میدان (اے نبرد آزماؤ) جاتا رہا،

کیوں ملیں ہاتھ، کیسا پچھتاوا ہم نے کچھ بھی نہیں گنوایا
ہے،
ہمتِ سخت جاں سلامت ہے، آتشِ انتقام سرد نہیں،
دائماً بغض شدت آمادہ،
(کشتی مادر آب افتادہ، برلب ایں نعرۂ باد چوں بادا)
کامیابی کا کلیہ آخر اس تماشے کے ماسوا کیا ہے؟

اب یہ کافر نہ منہ سے چھوٹے گا، یہ نشہ وہ ہے جو نہ ٹوٹے گا،
حشم و خشم کے مظاہروں کا اہتمام اب کیا کرے کوئی۔
ڈوب مرنے کا ہے مقام اگر اب تہ سنگ دست فرض کریں
اور ہم کورنش بجا لائیں،
تہ کریں زانوئے گدا پیشہ، اس سے شکرانۂ کرم مانگیں
آج تک جس کی پادشاہی کا بے تکاں مضحکہ اڑایا ہے
صورتِ حال اگرچہ مشکل ہے اور افتادِ سخت نازل ہے
پھر بھی ایسا کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پہ بدنما ہو گا۔
ہم شیاطین ہیں ہمیں لاریب ہستیٔ بے قضا مقدر ہے۔
ناری الاصل، آتمائی گن، یہ ابد تک تلف نہیں ہوں گے،
واقعہ فاجعہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور ہوا۔
عسکری زعم اگرچہ ٹوٹ گیا،
لیکن اس بھاؤ بھی نہیں مہنگا پیش بینی کا درکِ ذہن افروز،
اک زبردست امید کا امکان پھر ہمیں کر رہا ہے برانگیخت،
زور تزویر سے مسلح ہم حربِ خونیں کا غلغلہ کر دیں،
اور اپنے حریفِ اکبر سے کسی عنوان مفاہمت نہ کریں
وہ کہ اب خمرِ فتح میں سرشار،
عرش پر دھاندلی کے بل بوتے مستقل ہم کو دھونس دیتا ہے

ہاں کہو لا الہ الا اللہ!''[۸]

وہی روانی اور گرجدار لہجہ جو انگریزی متن کا خاصہ ہے۔ اردو میں بھی اپنی گھن گرج کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اردو ترجمے میں 'glory' کا ترجمہ 'نشہ' کیا گیا ہے جس نے معنویت سے بھرپور جملہ تراشا ہے۔ 'Shame' کا ترجمہ ''کلنک کا ٹیکہ'' اور 'Sole reigning' کا ہم پلہ لفظ ''لا الہ الا اللہ'' دیا گیا ہے جو اس تقریر کو اگر زبان و بیان کا ادبی شاہکار بتاتی ہے تو ساتھ ہی اس کا مذہبی اسطورہ ہونے کا بلاواسطہ اظہار بھی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح قصہ آدم

وحوا تمام انسانوں کا مشترک سرمایہ ہے اسی طرح مترجم نے اردو زبان کے مزاج اور لغت کے مطابق ان الفاظ کا انتخاب کیا جو اس ضمن میں مستعمل ہیں۔ وہی اکھڑ اور ضدی لہجہ جو "Injured Merit" کے نتیجے میں ابلیس نے اختیار کیا اردو ترجمے میں جھلکتا ہے جو اپنے ساتھی اور نائب کو حوصلہ دینے کے لیے اس نے اختیار کیا تھا۔ یوں ملٹن اپنے اسلوب کی تمام تر عظمتوں کے ساتھ اردو ترجمے میں زندہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

شعر کسی بھی شاعر کی ذاتی قلبی واردات اور تجربے کا بیان ہوتا ہے مگر یہ بات بھی کسی بحث کی محتاج نہیں کہ شاعر کی شخصیت اور ذات کی تشکیل میں دیگر خارجی عوامل ماحول اور معاشرے سے متعلق ہیں لہٰذا جب ایک شعر لکھا جاتا ہے تو وہ محض شاعر کے تجربے اور احساس و ادراک کا انعکاس ہی نہیں کرتا بلکہ:

> ہر شاعری کا ایک تاریخی، تہذیبی، فکری اور لسانی پس منظر ہوتا ہے۔ یہ پس منظر شاعری کو مخصوص فلسفہ، نقطۂ نظر، تلازمے، تجنیسیں، تشبیہیں اور استعارے دیتا ہے۔ فلسفہ اور نقطۂ نظر کا ترجمہ ممکن ہے لیکن باقی چیزوں کا ترجمہ اکثر و بیشتر ناممکن ہوتا ہے۔[۹]

ایسی زبانیں جہاں سماجی و ثقافتی ورثہ اور ادبی روایات مماثل ہیں وہاں تو ان تلمیحات و استعارات یا تشبیہات کا ترجمہ یا ترجمانی ممکن ہے اور تھوڑی بہت لفظی تبدیلی سے وہ متن دوسری زبان میں تقریباً انھی معنوں اور تاثر کے ساتھ منتقل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زبان کے مشترک لغت، زمینی قربتوں کے ساتھ ساتھ ثقافتی اشتراکات اور ادبی روایات میں مماثلت کی بدولت ترجمہ بھی اصل متن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ اس کی مثال اردو اور فارسی سے دی جا سکتی ہے جن کا نہ صرف ذخیرہ الفاظ کافی حد تک مشترک ہے بلکہ ایک ہی خطے میں ہونے کے سبب دونوں زبانوں کے تصورات عشق اور مضامین بھی مماثل اور ایک سے دوسری زبان کے قارئین کے لیے اجنبی نہیں ہوں گے مگر انھی مضامین و تصورات کو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے اور ممکن ہے ترجمہ ہونے کے بعد اردو کا صفِ اول کا شاعر انگریزی کا تیسرے درجے کا شاعر بن جائے اور ترجمے کا ایک مقصد جو اس نے شاعر کو دوسری زبان میں زندہ کرنا ہے، ہی فوت ہو جائے گا۔

ن م راشد اردو کے صفِ اول کے آزاد نظم نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں اردو کا تہذیبی رچاؤ اور فارسی تراکیب کی بندشیں ایک عجب سماں باندھتی ہیں۔ اس ذہین اور طباع شاعر نے اردو کے تہذیبی و لسانی سرمائے سے اپنے کلام میں اردو کی قدیم شعری لغت اور جدید طرز کو خوشگوار انداز میں ملایا ہے جس کی بدولت ان کی نظم میں روایتی ترنم بھی ہے اور خیالات کی

پیش کش کی طرزِ جدید بھی۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام چھپنے والے اردو شاعری کے نمائندہ نظم نگاروں کے تراجم یاسمین حمید نے کیے ہیں۔ ن۔م۔ راشد کی نظم ''اسرافیل کی موت'' کا متن اور ترجمہ ملاحظہ ہو:

Israfil's Death

Mourn the death of Israfil:
companion-friend of the gods,
god of words, of speech,
timeless spirit of the human voice,
boundless cry of the skies,
like a word unfinished is mute today.

Come, mourn his ill- timed dream;
by the trumpet he lies,
spat out on the shore by a storm,
silent, on the bright, sun-lit sand,
by its side, he sleeps!
His turban, his hair, his beard,
the secret of existance they bore,
now marred with dust;
torn away from his lips, his trumpet
lost in the din of its own screams, its pleas;

once it could set the world aglow.

Mourn his death;
once a melody, a pillar of pride,
a symbol of voices, eternal, of a realm unknown.

Angels all, mourn his death;
Adam's sons, distressed, grovel a dust;
God's eyes are torn with grief;
no sound alights from the skies,
no music from the divine abode.

Israfil's death
deprives the world of its bounty:
voices that nourished the vocal cords,
the musical strings.
How, what song will the singer sing,
silent are all impassioned hearts;
how will the dancer sway and swing,
silent are the dancing floors, the halls;
how will the preacher deliver his word,
silent are the doorways, domes of mosques;
how will intellect lay its trap,
silent are the soaring birds of flight.

Israfil's death is the death
of ears that listen,

of lips that speak
of visionary eyes,
of learned hearts;
sages, he fostered,
the wise he bred,
their charged thoughts,

their exchange of words;
now all in hiding,
their voices choked,
their vigour, their whirling passion spent,
in streets, the source of this spirit gone,
the last of our treasurest lost.

With Israfil's death,
time has frozen,
turned into stone,
put to sleep,
each voice devoured,
all beauty erased,
such desolation,
one cannot recall one's name!

With Israfil's death,
even tyrants of this world,
may not realize their dream
of playing god,
of sealing lips,

of gurading whispers
of the oppressed.[۱۰]

اسرافیل کی موت

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ خداؤں کا مقرب، وہ خداوندِ کلام
صوتِ انسانی کی روحِ جاوداں

آسمانوں کی ندائے بے کراں
آج ساکت مثلِ حرفِ ناتمام
مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ!

آؤ، اسرافیل کے اس خوابِ بے ہنگام پر آنسو بہائیں
آرمیدہ ہے وہ یوں قرنا کے پاس
جیسے طوفان نے کنارے پر اُگل ڈالا اسے
ریگِ ساحل پر، چمکتی دھوپ میں، چپ چاپ
اپنے صُور کے پہلو میں وہ خوابیدہ ہے!
اس کی دستار، اس کے گیسو، اُس کی ریش
کیسے خاک آلودہ ہیں!
تھے کبھی جن کی تہیں بود و نبود!
کیسے اس کا صُور، اُس کے لب سے دُور
اپنی چیخوں، اپنی فریادوں میں گم
جھلملا اُٹھتے تھے جس سے دیر و زود!

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ مجسم ہمہمہ تھا، وہ مجسم زمزمہ
وہ ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی غیبی صداؤں کا نشاں!
مرگِ اسرافیل سے
حلقہ در حلقہ فرشتے نوحہ گر،

ابنِ آدم زلف در خاک و نزار
حضرتِ یزداں کی آنکھیں غم سے تار
آسمانوں کی صفیر آتی نہیں
عالم لاہوت سے کوئی نفیر آتی نہیں!

مرگِ اسرافیل سے

اس جہاں پر بند آوازوں کا رزق
مطربوں کا رزق، اور سازوں کا رزق
اب مغنی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا
سننے والوں کے دلوں کے تار چپ!
اب کوئی رقاص کیا تھرکے گا، لہرائے گا کیا
بزم کے فرش و در و دیوار چپ!
اب خطیبِ شہر فرمائے گا کیا
مسجدوں کے آستان و گنبد و مینار چپ!
فکر کا صیّاد اپنا دام پھیلائے گا کیا
طائرانِ منزل و کہسار چپ!

مرگِ اسرافیل سے
گوشِ شنوا کی، لبِ گویا کی مَوت
چشمِ بینا کی، دلِ دانا کی مَوت
تھی اسی کے دَم سے درویشوں کی ساری ہاؤہُو
اہلِ دل کی اہلِ دل سے گفتگو
اہلِ دل، جو آج گوشہ گیر و سُرمہ در گلو!
اب تناناہُو بھی غائب اور یا رب ہا بھی گُم
اب گلی کوچوں کی ہر آواز بھی گُم
یہ ہمارا آخری ملجا بھی گُم!

مرگِ اسرافیل سے
اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، پتھرا گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا،
ایسی تنہائی کہ حسن نام یاد آتا نہیں
ایسا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں!

مرگِ اسرافیل سے
دیکھتے رہ جائیں گے دُنیا کے آمر بھی
زباں بندی کے خواب!
جس میں مجبوروں کی سرگوشی تو ہو
اُس خداوندی کے خواب![۱۱]

چند ایک مستثنیات کے علاوہ باقی پوری نظم لفظی ترجمے کی عمدہ مثال ہے۔ ن۔م راشد کی تراکیب کو بعینہٖ متبادل انگریزی لفظ کے ساتھ سطر بہ سطر ترجمہ کیا گیا ہے۔اور دونوں زبانوں کے مزاج کا اختلاف، ترکیب سازی کا انداز ترجمے کے عمل میں صاف نظر آتا ہے۔ترکیب در ترکیب اور فارسی کے پرشکوہ الفاظ سے بھرپور راشد کا اسلوب جب انگریزی میں منتقل ہوا تو راشد کی انفرادیت ترجمے کی نذر ہوگئی ہے۔ پروفیسر ظہورالدین لکھتے ہیں:

> اردو اور انگریزی دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔ دو مختلف تمدنوں تہذیبوں کی پیداوار ہیں۔ دو مختلف مزاجی اور جذباتی کیفیات کی حامل بھی ہیں۔اس لیے ایسے ترجمہ نگار کی ذمہ داریاں بدرجہا بڑھ جاتی ہیں جو اردو کے کسی فن پارے کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے جب تک یہ معلوم نہیں کہ اردو کے کسی محاورے کو انگریزی میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے یا انگریزی میں اس کا متبادل کیا ہے یا اگر متبادل نہیں ہے تو کن الفاظ میں مناسب طور پر اسے یورپی قارئین کے لیے قابلِ فہم بنایا جا سکتا ہے، وہ اس میدان میں کامران نہیں ہو سکتا۔ اردو میں ایک محاورہ ''دل باغ باغ ہونا'' اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ادبی سطح پر ہی نہیں روزمرہ گفتگو کی سطح پر بھی اکثر استعمال ہوتا سنا جاتا ہے۔غور سے دیکھیے تو یہ محاورہ اردو والوں کی ایک جذباتی کیفیت کا ہی اظہار نہیں کرتا بلکہ ان کی اس اجتماعی وقومی مزاجی کیفیت کا بھی مظہر ہے جسے ہم مبالغے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مبالغے کو انگریزی و یورپی زبانوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس حد تک نہیں۔
> اس لیے ہمیں اسے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ متبادل ایسا ہو جو انگریزی کے قارئین کے مزاج سے قریب

تر ہو۔ چنانچہ یہاں ہمیں "Over joyed" کی مدد سے ہی کام چلانا پڑے گا۔ یہ لفظ اردو والوں کے لیے یقیناً ''دل باغ باغ ہونا'' کا مترادف نہیں ہے لیکن انگریزی کے قارئین تک اس پیغام کو ضرور پہنچا دیتا ہے جو اصل محاورے میں مقید ہے۔ دونوں زبانوں سے پوری واقفیت رکھنے والا ترجمہ نگار چونکہ یہ جانتا ہے کہ کس محاورے یا لفظ یا استعارے وتشبیہ کو دوسری زبان میں کن مترادفات کے ذریعے بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس لیے اس کا ترجمہ اس شخص کے ترجمے سے یقیناً بہتر ہوگا جو اس جوہر سے کما حقہ آراستہ نہیں ہے۔[۱۲]

یہی مشکل انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہے مگر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دونوں زبانوں کے مترادفات کے استعمال سے واقفیت رکھنے والا مترجم ہی اس مشکل مرحلے سے کامرانی سے گزر سکے گا۔ لہٰذا شعر کا ترجمہ ایک ایسا امتحان ہے جس میں سے وہ مترجم ہی کامیابی سے ہمکنار ہوگا جو ہر ہر لفظ اور کنایے پر چوکنا ہو کر اس کام کو سرانجام دینے کی سعی کرے گا۔ لہٰذا مترجم کا علم اور مہارت دونوں کے ساتھ ساتھ اس کی لگن اور ان تھک محنت بھی درکار ہوگی تا کہ وہ متن کے قریب ترین ترجمہ کر سکے۔

Alone
From childhood's hour I have not been
As others were: I have not seen
As others saw; I could not bring
My passions from a common spring
From the same source I have not taken
My sorrow; I could not awaken

My heart to joy at the same tone;
And all I loved, I loved alone.
Then in my childhood in the dawn
Of a most stormy life - was drawn
From every depth of good and ill
The mystery which binds me still:

From the torrent, or the fountain,
From red cliff of the mountain,
From the sun that round me rolled
In its antumn tin of gold,
From the lightening in the sky
As it passed me flying by,
From the thunder, and the storm
And the cloud that took the form
(When the rest of Heaven was blew
of a deman in my view.[۱۳]

اب اسی نظم کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اکیلا''

دائیں بائیں جو لوگ تھے ان سا نہ تھا بچپن ہی کے زمانے سے
مری آنکھ نہ اوروں کی آنکھ سی تھی مرے جذبوں کا رنگ نرالا تھا
مرے دکھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی لوگوں کے رونے رلانے سے
مرے عیش و عشرت کی لہروں کا سب سے ڈھنگ نرالا تھا
جو کچھ بھی مجھے مرغوب ہوا، وہ صرف مجھے مرغوب ہوا
جو شخص مجھے محبوب ہوا، وہ صرف مجھے محبوب ہوا
وہ دورِ طفولیت جس کو اندھا طوفاں بن جانا تھا
وہ دور جو زیست کے دن سے پہلے آنے والا سویرا تھا
اس دور میں ہی اس بھید کے بندھن نے مرے دل کو گھیرا تھا

یہ بھید کہ جس کو نیکی بدی کی گہرائی سے آنا تھا
آنا تھا اندھے دھارے سے، آنا تھا مچلتے چشمے سے
آنا تھا چٹان کے دوارے سے، اونچے پربت کے پردے سے
سرگرداں سورج سے آنا تھا، میری زیست پہ چھانا تھا
وہ سورج جس کو خزاں میں افق پر سونے کا رنگ چڑھانا تھا
اس برق سے آنا تھا اس کو جو چمک اٹھتی ہے گھٹاؤں سے

اور شور سے رعد کے آتا تھا، آتا تھا روتی ہواؤں سے
آتا تھا ان طوفانوں سے جو سب کا دل دہلاتے ہیں
اور اک آوازِ مجسم بن کر دنیا پر چھا جاتے ہیں
ان بادلوں سے آتا تھا جو آکاش پر ڈیرا جماتے ہیں
اور میری نگاہوں میں کالے بھوتوں کے جھنڈ بناتے ہیں۔[۱۴]

ایڈگرایلن پو کی (۲۲) بائیس سطور پر مشتمل نظم کو میراجی نے (۲۰) بیس سطور میں ترجمہ کیا اور کیا خوب ترجمہ کیا کہ نہ صرف نظم کے ترنم اور آہنگ کو برقرار رکھا بلکہ پو کے الفاظ و تراکیب تک کو اس خوبصورتی سے جامہ پہنایا ہے کہ نظم اگر اردو کے ادبی نظام اور مروج اظہار یوں سے مملو ہے تو دوسری طرف ایڈگرایلن پو اپنی تمامتر فکر و فن کے ساتھ موجود ہے۔ پو کی وہ تخیلاتی دنیا جس کی بدولت وہ اپنے عہد اور گرد و پیش سے کٹا رہتا تھا، پوری شان و شوکت اور پراسراریت کے ساتھ ترجمے میں سطر بہ سطر اور قریباً اسی ترتیب سے منتقل کر دی گئی ہے۔ اپنے گرد و پیش سے الگ، تخیلاتی دنیا کا باسی ہونے کے سبب ایک طرف اگر 'Alone' کے واحد متکلم میں اداسی اور تنہائی نظر آتی ہے وہیں اس تنہائی پر ایک عجیب سا غرور بھی ہے جو اظہاریے کو دوہرے تاثر سے بھرپور بنا دیتا ہے۔ نظم کے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے تو میراجی اس تاثر کی ثنویت کو بھی اپنے ترجمے میں بخوبی منتقل کر پاتے ہیں۔

'And all I loved, I loved alone'

اس دوہرے تاثر کی عکاس خوبصورت سطر ہے جسے میراجی نے ایک کے بجائے دو سطور میں ترجمہ کیا ہے۔ شخص اور شے، کی جداگانہ حیثیت کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

جو کچھ بھی مجھے مرغوب ہوا، وہ صرف مجھے مرغوب ہوا
جو شخص مجھے محبوب ہوا، وہ صرف مجھے محبوب ہوا

ایڈگرایلن پو کی مذکورہ سطر کو ترجمہ کرتے ہوئے ان دو میں سے اگر کوئی ایک سطر بھی رکھ لی جاتی اور دوسری حذف کر دی جاتی تب بھی ابلاغ میں کوئی سقم نہیں ہوتا مگر دونوں سطور کو شاملِ ترجمہ کرنے سے ترجمے کی وہ تکنیک استعمال ہوئی ہے جس کو 'وضاحت' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے نظم کا تاثر گہرا بھی ہوا ہے اور متن سے وفاداری بھی برقرار رہی ہے۔ پو کی ترکیب 'Autumn tin of gold' کو ''وہ سورج جس کو خزاں میں افق پر سونے کا رنگ چڑھاتا تھا''، میں افق اضافہ ہے مگر شاعرانہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے میراجی نے

ایک امیج بنا دیا ہے۔اس ترجمے میں میراجی نے متن کی دو سطور کو شامل نہیں کیا یعنی:

"As it passed me flying by'

اور

"(When the rest of Heaven was blue)

پہلی سطر کو اگر ترجمہ کیا جاتا تو وہ برق جو گھٹاؤں میں چمک اٹھتی ہے، پو کے قریب سے گزرتے ہوئے چمکتی اور نظم کی معنویت میں مزید گہرائی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ پو کی خود کو اس زمینی سرحد سے بلند تصور کرنے اور جوش میں آئے ہوئے مظاہرِ فطرت میں بلا خوف وخطر گھومنے کی سوچ کو واضح کر دیتی۔ جبکہ دوسری سطر میں نیلے آسمان کے پیشِ منظر میں کالے بھوتوں کے جھنڈ بناتے بادلوں کی ہیبت ناکی مزید بڑھا دیتے۔اس چھوٹی سی کمی سے قطع نظر میراجی کے اس ترجمے کو ترجمے کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔نظم کے ترجمے میں مترجم کی چوکسی اور ہر ہر لفظ پر توجہ ہر کنایے کو اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ منتقل کرنے کی کوشش اور اس عمل میں اپنی ادبی روایت سے جڑے رہنے کی سعی وہ قابلِ تعریف عمل ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کیونکہ بقول ڈاکٹر عنوان چشتی:

> ترجمے میں تکنیک اور اسلوب کا کام آرائش نہیں بلکہ مرکزی خیال کی ترسیل یا اظہار ہے۔مترجم کو جان بوجھ کر کوئی نئی تکنیک یا اچھوتا اسلوب نہ اختیار کرنا چاہیے بلکہ ترجمے کے مکمل عمل کے دوران، اس کے موضوع، مواد اور مزاج کی مناسبت سے ایسی تکنیک اور اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو ہر طرح سے اس تصنیف کے بنیادی خیال یا تاثر کے اظہار میں مفید ثابت ہو۔یہی معاملہ ہیئت کا ہے۔مترجم کو ہیئت بھی عجیب وغریب نہ اختیار کرنی چاہیے بلکہ جو موضوع اور مواد کا تقاضہ ہو اس کے مطابق اختیار کرنی چاہیے.....ایک اعلیٰ درجے کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔اس کی زبان، تکنیک، اسلوب، اور ہیئت اور موضوع ومواد کے مطابق ہوتا ہے۔ترجمے کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے، نیز ادبی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔اس میں قارئین کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔منظوم ترجمے میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہوتی ہے۔اس طرح ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال یا انتقال فکر کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی بہت پیچیدہ اور

> محنت طلب عمل ہے۔ جس کے لیے تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ مترجم اگر ان اوصاف سے محروم ہے اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہتا ہے تو اٹلی کی ضرب المثل کے مصداق ایسا ٹرانسلیٹر (Translator) ٹریٹر (Traitor) ہوتا ہے۔[۱۵]

مزید برآں ترجمے کو مترجم کی طرف سے اپنے عجز اور نیازمندی کے اظہار کے علاوہ اپنی ذات کی نفی کہا جاتا ہے کیونکہ مترجم جب کسی اور تخلیق کار کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کے لیے تقریباً اسی کا قالب اختیار کر لیتا ہے تو یہ اپنی ذات کی نفی ہے اور مصنف یا شاعر سے اس کے 'وفادار' ہونے اور رہنے کا عہد ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت مدنظر رہے کہ ترجمہ اظہار ذات کا ذریعہ بھی ہے۔ کسی خاص شاعر یا متن کا انتخاب اور اسے ترجمے کے ذریعے زندہ کرنے کی خواہش کا مطلب مترجم کے اپنے ذاتی میلانِ طبع اور پسند و ناپسند کا اظہار ہے۔ لہٰذا یہ بات یاد رہے کہ ترجمہ مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کرنے کا عمل نہیں ہے۔ خصوصاً شعر کے فہم میں تو چونکہ ہر قاری پر ایک الگ ہی تاثر مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمے کے لیے کسی شاعر یا متن کے انتخاب کا فیصلہ دراصل مترجم کے کردار کی اہمیت پر دلیل ہے۔ یعنی کسی ایسے متن کا انتخاب کرنا جس نے مترجم پر جو تاثر مرتب کیا وہ اس کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اور ادب میں وہ تاثر یا اثر متعارف کرانے اور ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اندریں حالات

> اگر ہم یہ مان لیں کہ ترجمے چاہے 'وفادار' ہوں یا نہ ہوں وہ شائع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ اصل کے متعلق اپنے تاثر کے اظہار کی بدولت ترجمے کو 'غیر وفادار' ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا، تو اس معاملے کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ''وفاداری'' ترجمے کی ایک ایسی حکمت عملی (تزویر) ہے جو ایک مخصوص شعریات سے متعلق مخصوص نظریے کے ترتیب دینے سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اس کو ترجمے کی واحد ممکنہ حتی کہ قابلِ قبول حکمت عملی کے درجے تک بڑھاوا دینا خام خیالی اور بے کار بات ہے۔ اس طرح ترجمہ شدہ متون ہمیں تہذیبوں کے تعامل اور متون کی manipulation کے متعلق بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ نتیجتاً ایسے موضوعات شاید عمومی طور پر دنیا کے زیادہ (وسیع) مفاد میں ہوں بجائے اس کے کہ محض ہماری رائے کہ کوئی لفظ ''مناسب طور پر'' ترجمہ ہوا ہے کہ نہیں (کی تصدیق کر سکیں)۔

درحقیقت اپنے حمایتوں کے ''معروضی'' اور ''آزادقدری'' کے دعووں کے برعکس ''وفادارتراجم'' عموماً ایک کٹرنظریے سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔[۱۲]

شاعری کے ترجمے میں ایک سوال جومترجمین کو پریشان کیے ہوئے ہے کہ شعر کا ترجمہ شعر میں کریں یا نثر میں محض اس احساس کی ترسیل کی جائے۔ شاعری کے انگریزی سے اردو ترجمے میں بھی یہ مشکل بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس سلسلے میں متضاد آراء سامنے آتی ہیں جن کا جائزہ لے کر کوئی درمیانی راستہ تجویز کیا جانا ضروری ہے۔

شعر کی تاثیر یا تاثر کا دارومدار اس کی نازک خیالی اور احساس کے علاوہ اس بحر یا ترنم اور موسیقی پر بھی ہوتا ہے جس میں وہ تخلیق پاتا ہے۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری پروفیسر تہران یونیورسٹی کے مقالے ''ترجمۂ شعر'' کے مطابق:

لیکن شعر کا ترجمہ کرتے وقت لفظ (کلمہ) صرف معنی پر ہی دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کی صورت ملحوظ بھی اہمیت اور مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ شعر ایک ہنر ہے اس کی بنیاد تو لفظ ہی ہوتا ہے جس طرح موسیقی ہنر ہے مگر اس ہنر کی بنیاد خوبصورت آواز ہوتی ہے۔ جس طرح مصوری کی بنیاد خط اور رنگ اور مجسمہ سازی کی بنیاد سخت جسم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے شعر کو کلام کی موسیقی کہا جا سکتا ہے۔ شاعر الفاظ کو اپنے سلسلے کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ جس سے وہی دل آویز اور متناسب نظم وترتیب حاصل ہوتی ہے جو اس کے ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کو ایک خاص صورت میں ڈھالتا ہے جو ایک خاص معانی پر دلالت کرتی ہے۔ شاعری کے ہنر کا مقصد معانیٔ مقصود کو موسیقی کلام پر منطبق کرنا ہوتا ہے جس سے سننے والے میں ویسی ہی اثر پذیری کی حالت حاصل ہوتی ہے جو شاعر چاہتا ہے۔ پس شعری ہنر لفظوں کے انتخاب اور تنظیم کے دو مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک ظاہری اور دوسرے معنوی۔

شاعر کے نزدیک الفاظ کی تالیف اور انتخاب میں سب سے اہم نکتہ وزن اور قافیہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان میں شعر کے اوزان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر زبان میں مروج اور مانوس اوزانِ شعر مختلف ہوتے ہیں۔ فارسی، عربی اور اردو میں اوزانِ شعر کی بنیاد ہجے

پر، اس کے صوتی استداد کے فرق، زیر و بم یا بقول ابنِ سینا اور خواجہ نصیر الدین طوسی مقطعاتِ ممدودہ اور مقصورہ کی ترتیب یا ایرانی اور عرب ماہرین عروض کے مطابق متحرکات اور سواکن پر ہوتی ہے۔
انگریزی اور روسی اشعار میں ہجوں کی شدت اور خفت وزن کی بنیاد ہے۔ فرانسیسی اشعار میں ہجوں کی تقسیم بلحاظِ مساوی قطعات Equal Syllables وزن کی بنیاد ہے۔

یہ نکات اس لیے بیان کیے گئے تا کہ بتایا جا سکے کہ شعر کا ترجمہ کرنا مترجم کے لیے کتنا مشکل کام ہے۔ شعر کے ایک ٹکڑے کا ایک زبان سے دوسری زبان میں معانی کا منتقل کرنا آدھا کام ہے اور دوسرا آدھا مشکل کام صورت شعر یعنی موسیقی الفاظ ہے۔ اس موسیقی کو مندرجہ بالا نکات کی وجہ سے بعینہٖ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ سوائے ان چند صورتوں کے جن میں وزن کے مبانی اور انواع اوزان دونوں زبانوں میں یکساں مروج ہوں یا ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوں۔ جیسا کہ عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں ہیں۔ دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو دوسری زبان میں ایک ایسے قالب کی ضرورت ہوگی جو اصلی قالب کے بعینہٖ اگر مطابق نہیں تو کم از کم اس کے نزدیک ترین ہو۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم خود شاعر ہو۔ یہ ایک ایسی شرط ہے جس کا حاصل کرنا ہمیشہ ممکن نہیں۔

موسیقی الفاظ صرف وزن اور قافیہ تک محدود نہیں ہیں بعض بزرگ شاعروں کی کتابوں میں ملفوظ آواز کی تالیف بذات خود ایک ایسا آہنگ پیدا کر دیتی ہے جسے حروف کا نغمہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر فارسی جاننے والا حافظ شیرازی کا ایک دل آویز شعر سننے سے ویسی ہی لذت حاصل کرتا ہے جیسی موسیقی کے ایک نغمے سے حاصل ہوتی ہے جو غالباً اسی ملفوظ آواز کی حسن تالیف ہی سے پیدا ہوتی ہے۔[۱۷]

انھی مشکلات کے سبب شاعری کے ترجمے کو شعر میں ہی کرنے کو ناممکن قرار دے دیا گیا۔ ضروری یہ ہے کہ شعری ادب کو ترجمہ کرتے ہوئے مروجہ شعری صورت ہی دی جائے مگر (S.L) اور (T.L) میں اور ان کی ادبی روایتوں میں اگر اتنا فرق ہو جتنا انگریزی اور اردو میں

ہے تو پھر کیا صورت ہو؟ مثلاً انگریزی سے heroic couplet کو غزل میں ترجمہ کرنا تو آسان ہو سکتا ہے مگر دونوں کی زبان اور اساطیر و علامات دو مختلف نظام کیا اس ترجمے کو کامیاب بنا سکیں گے؟ غزل کی علامات اور لسانی ڈھانچہ کیا (Heroic Couplet) کے تاثر اور خیال کو اسی طرح اپنا سکے گا کہ ترجمہ انگریزی ادبی روایت کے ذائقے کو بھی برقرار رکھے اور اردو کی شعری روایت میں بھی قابلِ قبول قرار پائے۔

پروفیسر جیلانی کامران ''شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات'' بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> .....اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے تو اس شعریت کے ضروری ردھم اور کیڈنس بھی ہیں لیکن اردو ترجمے میں نہ تو وہ کیڈنس ہے اور نہ ردھم ہے۔تو اس سے یہی مراد لی جا سکتی ہے کہ اردو شاعروں نے ترجمے کے لیے اپنی پسند کے عروض استعمال کیے ہیں اور یوں شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے ہوئے آزادی انتخاب کا استعمال کیا ہے۔اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے وقت نظم کا پیکر بدل سکتا ہے، عروض برقرار نہیں رہتے، ردھم وہی نہیں رہتا اور زبان اور شعری جملے کا کیڈنس بھی قائم نہیں رہتا تو پھر شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا شعر کو شعر میں اس لیے ترجمہ کرنا لازمی ہے کہ معاشرے کی ادبی عادات ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کیا معاشرے کی ادبی عادات کو بدلا نہیں جا سکتا تا کہ شعری ادب کے مافیہ سے براہِ راست ہم کلامی ممکن ہو۔[۱۸]

معاشرے کی ادبی عادات سے سمجھوتہ کرنے کی صورت میں ترجمے کا مقصد اور معیار دونوں مجروح ہوتے ہیں۔آزاد ترجمے اور شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنے کی صورت میں ہونے والی تبدیلیوں اور متن کے اخفاء یا عدم ابلاغ کی ایک مثال گوئٹے کے شہرۂ آفاق ناٹک ''فاؤسٹ'' کے ترجمے سے دی جا سکتی ہے۔اس کے مترجم بشیشور پرشاد منور لکھنوی ہیں انھوں نے ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے مدد لی اور اسے اردو کا قالب پہنایا۔مترجم نے اپنے ترجمے کو خود ہی آزاد ترجمہ قرار دیا اور اس ترجمے کی تکنیک اور طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے ڈرامے کے تمہیدی منظر میں اسرافیل کے مکالمے کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

Raphael

The Chanting sun, as ever rivals
The chanting of his brother spheres.
And marches round his destined circuit.
A march that thunders in our ears.
His aspect cheers the hosts of Heaven
Though what his evence none can say,
These inconeivable creations
Keep the high state of their first day.[۱۹]

اسرافیل کے آٹھ سطور پر مشتمل اس ابتدائی مکالمے کو منور لکھنوی نے ترجمہ کیا تو یہی آٹھ سطور سولہ سطور پر محیط ہو گئیں۔

اسرافیل

ازل سے راستہ ہے جو معین
اسی میں ہے رواں خورشید روشن
گھری ہے راہ اس کی شورشوں سے
بھری ہے الجھنوں سے کاوشوں سے
جو عالم کر رہے ہیں دوستداری
حریفانہ ہیں نغمے ان سے جاری
جو دیکھا ہے یہ نظارہ یکایک
توانائی سے تازہ ہیں ملائک
بہت اس راز کا کھلنا ہے مشکل
کسی کو بھی نہیں قدرت یہ حاصل
ہے ساری کار سازی اک معمہ
ہے سب قدرت طرازی اک معمہ
وہ شانِ روزِ اول آج تک ہے
مرقع یہ مکمل آج تک ہے
ہے اس کی پائیداری پائداری
رہے گا تا ابد عالم یہ جاری[۲۴]

یہ ترجمہ اردو کی ادبی روایت اور عادت کے عین مطابق ہے۔نیز اگر یہ ترجمہ نہ بھی سمجھا یا بتایا جائے تو تب بھی یہ اردو کے سانچے اور ڈھانچے میں اتنی اچھی طرح سمایا ہوا ہے کہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔لیکن طبع زاد تخلیق نظر آنا یا محسوس ہونا ترجمے کا حسن نہیں بلکہ خامی ہے۔

اس ترجمے میں اپنی مرضی سے اضافے اور وضاحتیں شامل ہیں۔ بہت سی باتیں شعری رعایت اور وزن کی خاطر شامل ہیں۔اضافی اور زائد کلام کی کثرت کے ساتھ ساتھ وضاحت اور بات میں رہ جانے والے عدم تکمیل کے ایک احساس کو خود مترجم نے اپنی طرف سے بڑھا کر مکمل کر دیا ہے۔ مثلاً ''فاؤسٹ'' کے اسی ترجمے کی مثال میں آخری تین شعر ملاحظہ کیے جائیں:

ہے ساری کارسازی اک
معمہ
ہے سب قدرت طرازی
اک معمہ
وہ شانِ روزِ اول آج تک
ہے
مرقع یہ مکمل آج تک ہے
ہے اس کی پائیداری
پائیداری
رہے گا تا ابد عالم یہ جاری

یہ تین شعر فاؤسٹ کی محض دو سطروں کا ترجمہ ہیں یعنی

"These inconceivable creations
Keep the high state of their first day."

ترجمے کی دو سطور اس مفہوم کے ابلاغ کے لیے کافی تھیں یعنی

ہے سب قدرت طرازی
اک معمہ
وہ شانِ روزِ اول آج تک
ہے

باقی چار سطور یا تو وضاحت ہے اور یا پھر دو سطور کے مفہوم کو اندازِ دگر پیش کرنے کی کوشش۔ لیکن چونکہ اردو کے مروج سانچے اور ادبی عادات کے لیے مفہوم اور مصنف کی ترجمانی سے زیادہ کانوں اور دماغ کے مانوس، مروج طریقہ اختیار کی اہمیت زیادہ ہے لہٰذا مصنف نے اسی نظام کے اندر بجا طور پر خود کو لائق تحسین اور اپنی کاوش کو قابلِ فخر سمجھا۔

شاعری کلامِ مترنم ہے تو موسیقی تو بین الاقوامی زبان ہے۔ یہ اس تاثر اور اثر کا احساس دوبارہ بھی پیدا کر سکتی ہے جو کسی ایک دھن کو سن کر سامع پر طاری ہوا تھا۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ ایک دھن جو تاثر چھوڑتی ہے وہ اگر بعینہٖ کسی اور دھن سے پیدا نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کے قریب ترین تاثر تو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کو کلام منظوم میں ہی ترجمہ کرنے سے متعلق جو آراء موجود ہیں وہ اس تاثر کی ترسیل یا شاعرانہ وسائل کی مدد سے اس کی باز آفرینی پر زور دیتی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ جیسا مترجم شاعر بھی شعر کی ہیئت اور ساخت میں تبدیلی مگر تاثر کی یکسانیت پر

زور دیتا ہے۔

ادبی متون میں خیال اور اسلوب یا مضمون اور اس کی پیش کش کا انداز اپنی اپنی جگہ اہم ہوتا ہے مگر شعر میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ عموماً یہ دونوں الگ الگ نہیں کیے جا سکتے۔ بلکہ ایسے تراجم میں تو مترجم کو یہ انتخاب بھی کرنا پڑ سکتا ہے کہ وہ معنی کی قربانی دے یا اسلوب کی۔ ولا دیمیر نابوکوو لکھتے ہیں:

> پھر مسئلہ دلیل اور بحر میں انتخاب کا ہے۔ کیا کوئی ترجمہ اصل متن اور محض متن سے مکمل طور پر وفادار رہتے ہوئے اس کی ہیئت، وزن اور بحر کو قائم رکھ سکتا ہے؟ ایک ایسے فنکار کو، جو اپنی ہی ترنم ایک زبان کی حدود میں سرگرم، اس کی مشق نے قائل کر دیا ہو کہ مواد اور انداز ایک ہی ہیں۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے کہ کوئی فن پارہ متوقع مترجم کے لیے مواد اور انداز کے فرق کے ساتھ بھی سامنے آ سکتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی ایک کی پیش کش اور دوسرے کو مکمل طور پر رد کرنے کا سوال بھی اٹھ کھڑا ہو۔[۲۱]

انگریزی سے اردو میں شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ معاملہ درپیش ضرور ہوتا ہے۔ خصوصاً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شعر کا ترجمہ اردو کی کلاسیکی شعری روایت کا تسلسل ہی رہے حالانکہ یہ کوئی مقررہ اصول نہیں ہے۔ اس سے قبل یہ بات ہو چکی ہے کہ ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے کوئی حتمی قوانین یا ضوابط نہیں بنائے جا سکتے۔ ان میں شعورِ عصر کے مطابق عہد بہ عہد تبدیلیاں لائی جانی چاہییں۔ اس بات کو زوہر کے پولی سسٹم کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی ترجمہ شدہ متن ادبی پولی سسٹم میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور درحقیقت ترجمہ کسی بھی ادبی روایت میں نئی تبدیلیوں اور نئے امکانات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب ادب میں نئی تبدیلیوں کا عہد چل رہا ہو تو تراجم اس کی ایک اہم وجہ اور عامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ٹارگٹ لٹریچر میں ترجمے کے لیے جو متون منتخب کیے جاتے ہیں ان کے انتخاب میں بھی نئے نظریات اور رویوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تاکہ ترجمہ شدہ متون نہ صرف خیالات و افکار کے جمود کو توڑیں بلکہ اظہار کے وسائل اور ٹولز (Tools) میں جدت اور وسعت کے ساتھ ساتھ تنوع کا سبب بھی بنیں۔ زوہر کے بقول:

> غیر ملکی ادب پاروں کے ذریعے وہ (اصول و عناصر دونوں) خصوصیات ملکی ادب میں متعارف کروائی جاتی ہیں جو پہلے موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں نہ صرف حقیقت کے نئے نمونے جو پرانے اور تسلیم شدہ

مگر اب غیر موثر نمونوں کی جگہ لے لیں بلکہ دیگر خصوصیات کا ایک مکمل سلسلہ مثلاً نئی (شعری) زبان یا نئے مرتب کرنے کے خاکے اور تکنیکیں بھی شامل ہوں یہ ظاہر ہے کہ ترجمہ کیے جانے والے ادب پاروں کے انتخاب کا تعین اس صورت حالات کے مطابق ہوتا ہے جو مقامی پولی سسٹم پر حاوی ہو۔[۲۲]

انگریزی نظم کو اردو میں ترجمہ کرنے کو ناممکن العمل قرار دینے والے تراجم کو موجودہ ادبی پولی سسٹم میں رکھ کر نہیں دیکھتے۔اردو ادب میں شاعری کے منظوم ترجمے کی روایت نظم طباطبائی کی ''کورِ غریباں'' سے ہوئی جس کی مقبولیت کی بناء پر بعد میں انگریزی سے منظوم تراجم کا سلسلہ چل نکلا۔ رسالہ ''دلگداز'' سے شروع ہونے والی یہ تحریک ''مخزن'' کے اجراء سے زور پکڑتی گئی اور متعدد نظموں کے منظوم تراجم ہونے لگے جن کو باقاعدہ ''مخزن'' کے صفحات پر جگہ دی جاتی تھی۔متقدمین کے کیے گئے تراجم کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

''محمد حسین آزاد: اندھی پھول والی کا گیت (لارڈ لٹن)
اجڑا ہوا گھر (ایک انگریز شاعر)
بہار کا آخری پھول (ٹامس مور)
حسرت موہانی: بہار کا آخری پھول (ٹامس مور) ترانہ محبت (انگریزی سے)
ظفر علی خان: ندی کا راگ (ٹینی سن) وفا (ورڈس ورتھ)
عزیز لکھنوی: مٹی کا جوان چاند (ٹامس مور)
غلام بھیک نیرنگ: تربتِ جاناں، مقصد الفت، عالم پیری اور یادِ ایام، انجام محبت، جانِ شیریں (انگریزی سے)
نادر کاکوروی: مرحومہ کی یاد میں اور گزرے زمانے کی یاد (ٹامس مور)

ضامن کنتوری: بگل کی صدا، ایک آرڈن (ٹینی سن)
حافظ محمود شیرانی: موت کا وقت (انگریزی سے)
تلوک چند محروم: نغمات (شیکسپیئر) کوئل (ورڈس ورتھ) نسب (ہارڈی)، یونان کے جزیرے (لارڈ بائرن)[۲۳]

یہ فہرست تو متقدمین کی ہے اس کے بعد سے لے کر زمانہ حال تک کے شعراء نے اس عمل کو جاری و ساری رکھا ہے۔ترجمے کے اس عمل سے جہاں اردو زبان نے فیض حاصل کیا اور

نئی لسانی تشکیلات سے فیض یاب ہوئی وہیں اردو شاعری میں نظم کی متنوع اصناف اور ہیئتیں بھی در آئیں جو اردو شاعری کے آفاق کی وسعت میں ترجمے کے عمل دخل کی شاہد ہیں۔ اردو نظم میں میراجی کے ''مشرق و مغرب کے نغمے'' کا تعمیری کردار قابلِ ذکر ہے۔ صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

> اردو میں نظم بے قافیہ اور نظم آزاد کا فروغ اور اس کے وسیلے سے پیچیدہ تاثرات، شدید جذبات اور نازک محسوسات کا اظہار ایک بہت بڑی حد تک میراجی کے گوناگوں شعری تجربات کا مرہون ہے۔ اپنے عروج کے ایام میں میراجی کی نظم نے ایک ماورائی کیفیت اختیار کر لی تھی اور ایوان شعر میں ایک طلسماتی سی روشنی پھیلا دی تھی پھر اس روشنی سے بیسیوں اور مشعلیں روشن ہوئیں اور بہت سی اور قندیلیں جگمگائیں اور شعر کی مملکت میں معانی کا سکہ چلا اور زبان کی وسعتیں فکر کا سہارا پا کر انجانی حدود تک پھیلتی چلی گئیں۔[۴۴]

انگریزی نظم کے اردو میں ترجمے کی بہترین مثال ''یادِ ماضی'' کو سمجھا جاتا ہے۔ نظم اور اس کے ترجمے کو دیکھا جانا ضروری ہے تا کہ اردو مترجمین کی عمومی روش پر روشنی ڈالی جا سکے۔

The Light of the other Days
Oft, in the stilly night,
Ere slumber's chain has bound me,
Fond memory brings the light,
of other days around me:
The Smiles, the tears
of boyhood's years.

The words of love then spoken,
The eyes that shone
Now dimmed and gone
The cheerful hearts now broken
Thus, in the stilly night
Ere slumber's Chain has bound me

of other days around me.
When I remember all
The freinds, so linked together,
I have seen around me fall
Like leaves in wintry weather
I feel like one who treads alone
Some banquet-hall deserted,
Whose lights are fled,
Whose garlands dead,
And all but he departed!
Thus in the stilly night,
Ere Slumber's chain has bound me,
Sad memory brings the light of
other days around me.[۲۵]

''یادِ ماضی''

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دل چسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی وہ رونا اور ہنسنا کبھی

پھر وہ جوانی کے مزے وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عیش وہ مہر و وفا وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب یاد آتی ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کمہلایا ہوا سوکھا ہوا ، بکھرا ہوا

روندا پڑا ہے خاک
پہ
یوں ہی شب تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں — گزرے ہوئے دن رنج
کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
ان حسرتوں کی قبر
پہ
جو آرزوئیں پہلے تھیں — ہر غم سے حسرت بن گئیں
غم دوستوں کے فوت کا — ان کی جوانا موت کا
لے دیکھ شیشے میں مرے — ان حسرتوں کا خون ہے
جو گردشِ ایام سے — یا قسمت ناکام سے
یا عیشِ غم انجام سے — مرگِ بتِ گلفام سے
سینے میں میرے مر گئیں — کس طرح پاؤں میں حزیں
قابو دلِ بے صبر پہ
جب آہ ان احباب کو — میں یاد کر اٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے چل دیے — جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں — گر جائیں سب قبل از
خزاں
وہ خالی رہ جائے
شجر
اس وقت تنہائی مری — بن کر مجسم بے کسی
کر دیتی ہے پیشِ نظر — ہو حق سا اک ویران گھر
برباد جس کو چھوڑ
کر
سب بسنے والے
چل دیے
ٹوٹے کواڑ اور کھڑکیاں — چھت کے ٹپکنے کے نشاں

پرنالے ہیں روزن نہیں
یہ ہال ہے آنگن نہیں
پردے نہیں چلمن نہیں
اک شمع تک روشن نہیں
وہ خانۂ خالی ہے دل
میرے سوا جس میں کبھی
جھانکے نہ بھولے سے کوئی
پوچھے نہ جس کو دیو بھی
اجڑا ہوا ویران گھر
یوں ہی شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں
گزرے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمع بے کسی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد[۲۶]
چاک پر

نادر کوروی کا یہ ترجمہ اردو میں بہترین ترجمے کا نمونہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چھبیس سطور کی نظم کو تہتر (۷۳) مصرعوں میں ترجمہ کر کے مترجم نے نہ تو متن سے وفاداری برقرار رکھی اور نہ ہی اردو کے مروجہ سانچوں اور اظہاریوں میں کوئی اضافہ کیا۔ اردو ادب کے قارئین کے ذوق کو یہ نظم اس لیے بھی بھائی کہ اس میں انھوں نے ترجمے کا مزا بھی لیا اور تخلیق کی چاشنی سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ یعنی ہینگ لگی نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آ گیا۔ ان کی سماعتوں نے کوئی غیر معمولی اور نئی بات جو ناگوار گزرتی، بھی نہ سنی اور ٹامس مور سے بھی آشنائی ہو گئی۔ گویا

رند کے رند ہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

ڈاکٹر عنوان چشتی نے مور کی اسی نظم کی ابتدائی تیرہ سطور کا نثری ترجمہ یوں درج کیا ہے:

خاموش رات میں

اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حائل (حمائل) کر دے
میری پسندیدہ یادداشت
ماضی کے ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جو میرے چاروں طرف پھیلے ہوئے
ہیں مسکراہٹیں اور آنسو
بچپن کے ایام
پیار بھری باتیں جو زیرِ لب دہرائی گئی ہیں
اور وہ آنکھیں جن میں چمک تھی

اور جواب ماند ہیں اور بجھ چکی ہیں
اور حسرت سے لبریز دل جواب ٹوٹ چکا ہے
اس طرح اس رات کی خاموشی میں (ایک ایک کر کے یاد آتی ہے)
اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حائل کر دے
میرا ماضی مجھے محصور کر چکا (ہوتا) ہے[۲۷]

یہ ترجمہ نثری ہے اور بظاہر نغمگی اور شعریت کا حامل نہیں ہے مگر اس میں متن سے وفاداری کی خاصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حشو وزوائد سے پاک اور شاعر ہی کے خیال اور الفاظ کی قریب ترین پیروی ہے۔ اس ترجمے سے اگر چہ اردو کے روایتی قاری کے کان قدرے اضطراب محسوس کریں گے کیوں کہ یہ نظم سے زیادہ نثر کا ٹکڑا ہے لیکن اگر ترجمہ مصنف اور شاعر کی اصل روح اور انداز کو منتقل نہ کر پائے تو وہ کاہے کا ترجمہ ہوگا۔

انگریزی شاعری کے کلاسیکی رنگ سے بغاوت کا علمبردار شیلے ہے۔ جس نے دنیا کو سدھارنے کے جذبے کے تحت اپنے افکار سے فکر وعمل کی ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس کے کلام کی موسیقی اور شاعرانہ زبان نے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا۔ ثاقب رزمی نے ''شیلے گیٹس بائرن کی نمائندہ نظمیں'' کے عنوان سے انگریزی کے تین اہم شاعروں کی چنیدہ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ متن سے وفاداری کا بہترین مظاہرہ ہیں۔ محمد علی صدیقی کتاب کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

> ثاقب رزمی بحیثیت مترجم اس حد تک کامیاب ہیں کہ مجھے ان تراجم کے مطالعہ کے دوران بارہا یوں محسوس ہوتا رہا کہ جیسے یہ تراجم نہ ہوں، ثاقب رزمی نے تراجم کے بہانے اپنی طبع زاد یا بیرونی شعرا سے ماخوذ موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ لیکن اصل اور ترجمہ میں حیران کن حد تک معنوی اور تمثالی یکسانیت کے باوجود ترجمے اس درجہ کھلے کھلے اور آزاد نظر آتے ہیں کہ ہمیں یہ کہتے بنتی ہے کہ تراجم خوب ہی نہیں، اعلیٰ ہیں اور اس خارزار میں قدم رکھنے والوں کے لیے قابلِ تقلید نمونے بھی۔[۲۸]

مثال کے طور پر شیلے کی نظم ملاحظہ ہو:

To

Music, when soft voices die,
Vibrates in the memory-

Odors, when sweet violets sicken,
Live with in the sense they quicken,

Rose leaves, when the rose is dead,
Are heaped for the beloved's bee!
And so thy thoughts, when thou art gone,
Love itself shall slumber on.[۲۹]

اس نظم کو ٹا قب رزمی نے یوں ترجمہ کیا ہے:

کے نام
موسیقی، جب نرگیں گتیں تحلیل ہو جاتی ہیں،
تو حافظہ میں مرتعش رہتی ہے
خوشبوئیں، جب بنفشہ کے عطر بیز پھول مرجھا جاتے ہیں
تو اسی حس میں محفوظ رہتی ہیں، جسے وہ اہتزاز میں لاتی ہیں

گلاب کی پتیاں، جب گلاب پژمردہ ہو جاتا ہے
تو محبوبہ کی سیج کے لیے جمع کر دی جاتی ہیں
اور اسی طرح جب تم چلی جاتی ہو
محبت خود تمہاری یادوں کو اپنی سیج بنا لے گی۔[۳۰]

یہ نظم کا حرف بہ حرف اور سطر بہ سطر ترجمہ ہے۔ پہلے بند میں اگر لفظ موسیقی کو دوسری سطر میں درج کیا جائے اور لفظ ''خوشبوئیں'' کو چوتھی سطر میں تحریر کیا جائے تو نہ صرف یہ مکمل طور پر نثری بلکہ زیادہ رواں ترجمہ بن جائے گی۔ یعنی

جب نرگیں گتیں تحلیل ہو جاتی ہیں
تو موسیقی حافظے میں مرتعش رہتی ہے
جب بنفشہ کے عطر بیز پھول مرجھا جاتے ہیں
تو خوشبوئیں اس حس میں محفوظ رہتی ہیں جسے وہ اہتزاز میں لاتی ہیں

آخری دو سطور میں زمانے یعنی Tense کی مطابقت نہیں رکھی گئی ہے جو بادی النظر میں اس نظم کے ترجمے کی واحد غلطی نظر آتی ہے اور جو عموماً حرف بہ حرف ترجمے یا سطر بہ سطر ترجمے کی صورت میں سرزد ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اگر

And so thy thoughts, when thou art gone,
Love itself shall slumber on.

کا ترجمہ فعل کی حالت کے مطابق اور مطابقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا جائے تو اس کا ترجمہ یوں کیا جانا چاہیے تھا۔

اور اسی طرح جب تم چلی جاؤ گی
محبت خود تمہاری یادوں کو اپنی سیج بنا لے گی

لہٰذا ان معمولی خامیوں سے قطع نظر ثاقب رزمی نے شیلے کے خیالات اور الفاظ کو اردو میں قریباً اسی طرح کے نرم اور سبک الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اور نظم کو اگرچہ نثری نظم کی صورت میں ترجمہ کیا ہے لیکن یہ حشو و زوائد سے پاک اور قابلِ تحسین حد تک متن سے وفادار ترجمہ ہونے کے ساتھ بھرپور تاثر کا حامل ترجمہ بھی ہے۔ جس میں وہی جذبہ ہدفی زبان کے الفاظ میں بھی جلوہ گر ہے جو انگریزی میں ہے اور نظم کو پڑھ کر کم و بیش وہی تاثر مرتب ہوتا ہے جو اصل زبان کے قاری تک منتقل ہوا ہو۔

ثاقب رزمی ہی نے لارڈ بائرن کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا اور بقول الطاف جاوید:

.....ان تراجم کی بے مثل خصوصیت یہ ہے کہ یہ انتہائی شاعرانہ زبان رکھتے ہیں اور اس کے باوجود مترجم نے ان شعرا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی خیال یا تصور ایزاد نہیں کیا۔ اس حقیقت نے ان تراجم کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت دے دی ہے۔ فی الواقع اتنی ارفع سطح پر ترجمہ کی یہ کوشش اردو ادب میں اولیت رکھتی ہے۔[۳۱]

ان کی نظم کا متن یہ ہے:

Stanzas for Music
(There be none of Beauty's Daughters)
There be none of Beauty's daughters
With a magic like thee;
And like music on the waters
Is thy sweet voice to me:

When as if its sound were causing
The Charmed ocean's pausing,
The waves lie still and gleaming,
And the lulled winds seem dreaming;
And the midnight moon is weaving
Her bright chain o'ev the deep;
Whose breast is gently heaving,
As an infant's asleep:

So the spirit bows, before thee,
To listen and adore thee;
With a full but soft emotion,
Like the sweet of summer's ocean.[۳۲]

ثاقب رزمی کا ترجمہ یہ ہے:

''اشعار.....موسیقی کے لیے
دخترانِ حسن میں کوئی ایسی نہیں
جو تمہاری طرح جادو اثر ہو،
میرے لیے تمہاری خوش آہنگ آواز اس طرح ہے
جیسے آبِ رواں پر موسیقی کی پھوار پڑتی ہے
اس کی آواز سے بحرِ مسحور ساکن معلوم ہوتا ہے

موجیں ساکت اور درخشاں ہو جاتی ہیں
اور آہستہ خرام ہوائیں خوابِ شیریں میں کھوئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں
ماہِ نیم شب سمندر پر اپنی جھلملاتی زنجیروں کا جال بن رہا ہے،
سینہ بحر میں طفل خوابیدہ کی طرح
ایک دھیما زیر و بم ہے:
اس لیے روح تمہارے حضور میں جھلکتی ہے
تا کہ تجھے سُن سکے اور تمہاری پرستش کر سکے،

ایک بھرپور لیکن نرم جذبے کے ساتھ،
تابستانی سمندر کے تموج کی طرح [۳۳]

ثاقب رزمی نے لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کرتے ہوئے بھی جہاں ممکن ہوا بہت خوبصورتی سے اپنے ہنر اور شاعرانہ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً:

When as if its sound were causing,
The charmed ocean's passing

کو محض ایک سطر میں سمیٹتے ہوئے یوں لکھا ہے:

اس کی آواز سے بحرِ مسحور ساکن معلوم ہوتا ہے۔

جبکہ اس کے بعد کی دو سطور:

And the midnight moon is weaving
Her bright chain over the deep

کو بھی ایک سطر میں یوں قلم بند کیا ہے:

''ماہِ نیم شب سمندر پر اپنی جھلملاتی زنجیروں کا جال بُن رہا ہے۔''

لہٰذا ایسا ترجمہ لائقِ داد و تحسین ہے کیوں کہ یہ حتی الامکان نظم کی روح کے ساتھ ساتھ اس کے ڈھانچے اور سانچے تک کو ترجمے میں منتقل کرنے کی ایک کوشش ہے۔

پرانے ادبی منظرنامے میں عروض اور قوافی کی پابندیاں تھیں۔ غزل کے ساتھ ساتھ نظم کا بھی مقفّٰی و مردف ہونا ضروری تھا۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ عمل موجود تھا کہ شعر کو شعر میں ترجمہ کیے بنا چارہ نہ تھا اور مشکلات اس لیے بڑھ جاتی تھیں کہ انگریزی اور اردو کے مزاج اور شاعرانہ وسائل میں کافی فرق تھا۔ مگر اب اردو کا عصری ادبی منظرنامہ کچھ اور ہے۔ نظم میں معریٰ، آزاد، نثری ہر طرح کی نظم کے تجربے اور ہیئتیں موجود ہیں لہٰذا شاعری کو ترجمہ تو شاعری ہی کی شکل میں کیا جا سکتا ہے مگر صورتِ نظم کا انتخاب مترجم کو دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ شعری وسائل کو کام میں لا کر اس تاثر کو نظم میں منتقل کر دے اور یہی مشقت او رانتخاب صورتِ مترجم کو تخلیق کار کے درجے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اگر ماخذ زبان میں نظم یا شعر کی صورت ہدفی زبان کے موجودہ پیمانوں اور ہیئتوں میں ترجمہ نہیں ہو پا رہی تو ترجمے کا عمل روکنے اور متن کو ناقابلِ ترجمہ قرار دے کر یہ کوشش ترک کر دینا نہ تو مترجم کے شایانِ شان ہے اور نہ ہی ہدفی زبان کے ادبی منظرنامے کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ پرانے اور بے لچک اصولوں اور ادبی قواعد کا پابند ہو کر رہنے کے بجائے اظہار کے نئے وسائل تلاش کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ادب میں نئی نئی اصناف اور طرزِ اظہار اور ہیئتوں کی تلاش ہی کسی ادبی روایت کے تسلسل کی ضمانت ہوتی

ہے۔ترجمے کو نہ تو ماخذ زبان کے ادبی معیارات کے مطابق جانچا جانا چاہیے اور نہ ہدفی زبان کی ادبی کسوٹی پر پرکھا جائے بلکہ ترجمے میں رہ جانے والی اس کجی کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے کیونکہ ترجمہ بے شک کوئی بہت بڑی تخلیقی کاوش یا ادبی فن پارہ ثابت نہ ہو مگر وہ ہدفی زبان کے تنگ دامن کی نشاندہی ضرور کرتا ہے اور اس کے وسائلِ شعری میں مزید ترقی اور بہتری کی گنجائش کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنے کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مترجم تاثر کو ہدفی زبان میں منتقل کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی صنعت شعر کی بحر یا ہیئت کا انتخاب تو مترجم اپنے دستیاب وسائل میں سے کر سکتا ہے تا کہ اس تاثر اور احساس کو منتقل کر سکے مگر شاعری میں خیال کی خوبصورتی صنعتوں کے استعمال سے اس درجہ جڑی ہوتی ہے کہ ان میں تبدیلی شعر کو ایک نیا قالب اور روپ دے دیتی ہے جو پچھلے یعنی ماخذ زبان والے قالب سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ان صنائع لفظی و معنوی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا محال ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایہام یا (Pun) کی صنعت جس میں ایک لفظ کے مختلف معنوی پہلوؤں کی بدولت شعر کا لطف دوبالا ہوتا ہے اور اس کی معنوی جہات بڑھ کر شاعر کی قادرالکلامی اور الفاظ کے استعمال کا سلیقہ ظاہر کرتی ہیں۔مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اگر ماخذ زبان میں ایک لفظ دو معانی دے رہا ہے اور یہی دو معانی اس شعر کی خوبی ہوں تو کیا ہدفی زبان میں یہ صنعت بعینہٖ استعمال ہو پائے گی اور یا پھر دو الگ الگ الفاظ استعمال کر کے ان کی تشریح یا وجہِ استعمال کو حاشیے میں دے دیا جائے۔ولادیمیر نابوکوو اس مشکل صورت حال کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتا ہے:

> مترجم کو نہ صرف متن کا لازمی نمونہ (پیٹرن) بلکہ وہ تمام مستعارات جو اس نمونے کی بنت میں شامل ہیں، مستقل اپنے ذہن میں رکھنے چاہیے۔بحر یا میٹر (ترنم) کی خاطر کوئی بھی چیز شامل نہیں کی جا سکتی۔[۳۴]

ولادیمیر نابوکوو اس ضمن میں شطرنج کے مہروں کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ شطرنج کے کھیل میں کھلاڑی کو انھی مہروں سے کام چلانا پڑتا ہے جو اس کو دستیاب ہیں۔کھیل میں داؤ چلنے کے لیے وہ کوئی نیا مہرہ نہیں لا سکتا۔یہ انتخاب اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ہاں وہ انھی مہروں کو اپنی مرضی اور انتخاب کے علاوہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ادل بدل کر چل ضرور سکتا ہے۔ظاہری بات ہے کہ یہ کام اول درجے کی دماغی مشقت اور مہارت کا متقاضی ہے۔چنانچہ اس مشکل کو دیکھتے ہوئے وہ تین نتائج نکالتا ہے۔

اول یہ کہ شاعری کا منظوم ترجمہ ناممکن ہے۔

دوم یہ کہ ایک شعر کے ترجمے میں وضاحتی حواشی دینا ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کی تشریح و توضیح صفحوں کے صفحوں پر پھیلی ہو گی۔ اور سوم یہ کہ شاعری کو ایک معقول قطعیت کے ساتھ ترجمہ کرنا بھی ناممکن ہے۔

ولادیمیر کے ان تینوں نتائج کو دیکھ کر یا تو کوئی نظم ترجمہ ہوسکتی ہے اور یا پھر بالکل ہی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جہاں یہ صورت واقعہ پیش آ جائے وہاں یہ ذمہ داری مترجم پر عائد ہوتی ہے کہ وہ نظم کا منظوم ترجمہ کرنے کے بجائے اسے نثر میں ترجمہ کر دے اس کی مثال کے طور پر ہم سلیم الرحمٰن کی ''جہاں گرد کی واپسی'' کو پیش کر سکتے ہیں۔ مشکل بحر اور پیچیدہ زبان کے ساتھ ساتھ اوڈیسی یونانی زبان و بیان اور عقائد کا اعلیٰ نمونہ تھی جس کو اردو جیسی نوخیز اور نوآموز زبان اپنے دامن میں منظوم طور پر سمو نہیں سکتی تھی لہٰذا سلیم الرحمٰن نے اس عظیم بیانیے کو نثری ترجمے کا روپ دیا۔

مگر یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ موجودہ ادبی منظر نامے میں نثری ترجمہ شاید ایک پرانی اور غیر مروج اصطلاح لگے کیونکہ اردو زبان کی منظوم ہیئتوں میں نثری نظم بھی اپنی جگہ اور شناخت بہرحال بنا چکی ہے اور لکھی جا رہی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ اب اردو میں منظوم ترجمہ شاید اتنی ناممکن یا مشکل بات نہیں رہی جتنی اس سے پہلے کے منظر نامے میں لگا کرتی تھی لہٰذا ترجمے کے لیے مترجم اور قاری دونوں کو یہ قبول کرنے کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ترجمہ ہوتا ہے اس میں اصل فن پارہ یا اصل فن پارے جیسی اکملیت دیکھنے کا خیال عبث ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ممتاز حسین، ترجمہ کے چند پہلو، مذاکرہ، مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن، مرتبہ نثار احمد قریشی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۲۔

Croce, Benedetto. Aesthetic, translation, Douglas Ainslie, London, 1992, pp.68,73

"Faithful ugliness and faithless beauty" proverbial, we cannot reduce what has already possessed aesthetic form to another form also aesthetic. Unaesthetic translations are simple commentaries. But there is relative possiblity of translations not as reproductions, but as productions of similar expressions. The translation called good, has orignial value as a work of art.

۳۔ Sajjad Sheikh, Translator, Selected Poems of Yusf Zafar, Ray publications Rawalpindi, June 2005, P.394

۴۔ ایضاً، ص۴۰۶

۵۔ ایضاً، ص۴۰۷

۶۔ ظہور الدین، پروفیسر، فنِ ترجمہ نگاری، سیمانت پرکاشن، ۹۲۲، کوچہ روہیلا خان، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۸

۷۔ John Hollander, Editor, Paradise Lost and Paradise Regained, New American Library INC, New York, 1968, P.49-50

۸۔ شوکت واسطی، مترجم، فردوسِ گم گشتہ، بزم علم وفن پاکستان، طبع دوم، ۱۹۹۴ء، ص۱۲۔۱۱

۹۔ خلیق انجم، شاعری کا ترجمہ، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم، طبع سوم، ستمبر ۱۹۹۶ء، ص۱۳۸

۱۰۔ Yasmeen Hameed, Translator, Pakistani Urdu Verse An Anthology, Oxford University Press, 2010, P.2-6

۱۱۔ Abid, P.3-7

۱۲۔ ظہور الدین، پروفیسر، فنِ ترجمہ نگاری، ص۹

۱۳۔ famouspoetsand Poems.com

۱۴۔ میرا جی، مشرق و مغرب کے نغمے، آج کی کتابیں، کراچی، طبع دوم، نومبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۷،۲۰۶

۱۵۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، منظوم ترجمے کا عمل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، ص ۱۵۲۔۱۵۱

۱۶۔ Andre, lefever, "Translation, Rewriting and the Manipulation of Literary fame" Routlegdge, 11 New Fetter Lane, London E&P 4EE 1992, P.51

اصل متن یہ ہے:

> "If we accept that translation get publishers whether thay are "faithful" or not, and that there is little one can do to prevent an "unfaithful" translation from projecting its own image of the original that ought to be an end to the matter. "Faithfulness" is just one translational strategy that can be inspired by the collecation of a certain idealogy with a certain poetics. To enalt it as the only strategy possible or even allowable, is as utopian as it is futile. Translated tents as such can teach us much about the interaction of cultures and the manipulation of tents. These topics, in turn, may be of more interest to the world at large tham our poinion as to whether a certain word has been "properly" translated or not. Infact, far from being "objective" or "valude free", as their advocated would have us believe, "faitful translations" are after inspired by a conservative ideology."

۱۷۔ بحوالہ محمد ادریس چیمہ، ارداد سیمینار ترجمہ کابل، افغانستان (۲۰ جون تا ۲۵ جون ۱۹۶۶ء)

مشمولہ تحقیقات اردو، ص ۲۵۰

۱۸۔ جیلانی کامران، پروفیسر، شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات مشمولہ روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۷

۱۹۔ Faust, Prologue in Heaven, Maynard Mack, General Editor "The Continental Edition of world Masterpieces" w.w.Norton and company INC, New York, 1956, 1965, P.1213

۲۰۔ بشیشو ر پرشاد، منور لکھنوی، فاؤسٹ، پاکستان جرمن فورم کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۹

۲۱۔ Nabokov Valadimir, Problems of Translation Onegin, in English, The Translation Studies Reader, edited by Lawrence Venuti Routledge, 11 New Fetter Lane, London, EC4P, 4EE, 2000, P

اصل متن یہ ہے:

"The problem, then, is a choice translation while rendering with absolute Fidelity the whole tent, and nothing but the tent keep the form of the original, its rhythm and its rhyme? To the artist whom practice within the limits of one language, his own, has convinced that matter and manner are one, it comes as a shock to discover that a work of art can present itself to the would - be translator as split into form and cantent, and that the quertian of rendering one but not the other may arise at all."

۲۲۔ Zohar Itamar Even, The Positian of Translated Literature Within the Literary Poly system, The Translation Studies Reader, editor Lawrence Venuti

Routledge London and New York, P193

اصل متن یہ ہے:

"Throught the foreign works, features (both principles and elements) are introduced into the home literature which did not exist there before. These include possible ont only new models of reality to replace the old and established ones that are no longer effective, but a whole range of other features as will, such as a new (poetic) language, or compositional patterns and techniques. It is clear that the very principles of selecting the works to be translated are determined by the situation governing the (home) polysystem."

۲۳۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ، مشمولہ رودادِ سیمینار اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۹۲

۲۴۔ صلاح الدین احمد، میراجی کی نثر، مشمولہ مشرق ومغرب کے نغمے، میراجی، آج کی کتابیں، کراچی، طبع دوم، نومبر ۱۹۹۹ء، ص۱۲

۲۵۔ Arthur Quiller - Couch-ed. 1919, The Oxford book of English verse, 1250-1900, Bartleby.com

۲۶۔ میراجی، مشرق ومغرب کے نغمے، آج کی کتابیں، کراچی، ص۱۰۶

۲۷۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، منظوم ترجمے کا عمل، مشمولہ ترجمے کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، ص۱۴۸

۲۸۔ محمد علی صدیقی، پیش لفظ، شیلے، کیٹس، بائرن کی نمائندہ نظمیں، مترجم ثاقب رزمی، آئینہ ادب، چوک مینارانارکلی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۱۳

۲۹۔ Eastman M, Arthur, co-codinating, The Norton Antholoy of Poetry, editior WW. Norton and company

INC, New York, 1970, P.73

۳۰۔ ثاقب رزمی، مترجم، شیلے کیٹس، بائرن کی نمائندہ نظمیں، آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۳۲

۳۱۔ الطاف جاوید، فلیپ، ثاقب رزمی، فلیپ

۳۲۔ Eastman M, Arthur, co-codinating, The Norton Antholoy of Poetry, editior WW. Norton and company INC, New York, 1970, P.619

۳۳۔ ثاقب رزمی، مترجم، شیلے کیٹس، بائرن کی نمائندہ نظمیں، آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۷

۳۴۔ Nabokor Valadimir, Problems of Translation, Onegin, in Enghlish (given above) P82

ابصل متن یہ ہے:

"The translator should conrtantly bear in mind not only the essential pattern of the tent but also the borrowings with which that pattern is intervoven can anything be added for the sake of rhyme or meter.